اکائی 27 پریم چند کے معاصرین

ساخت

27.1 اغراض ومقاصد

27.2 تمہید

27.3 پریم چند کے معاصرین

27.3.1 راشد الخیری

27.3.2 سجاد حیدر یلدرم

27.3.3 سلطان حیدر جوش

27.3.4 نیاز فتح پوری

27.3.5 سدرشن

27.3.6 علی عباس حسینی

27.3.7 اعظم کریوی

27.4 آپ نے کیا سیکھا

27.5 اپنا امتحان خود لیجیے

27.6 سوالات کے جوابات

27.7 فرہنگ

27.8 کتب برائے مطالعہ

27.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- پریم چند کے معاصرین سے متعارف ہوں گے
- پریم چند کے معاصرین کی افسانہ نگاری سے واقف ہوں گے

27.2 تمہید

پریم چند اردو افسانہ نگاری کا ایک ایسا نام ہے جسے کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بھلے ہی وہ اردو کے پہلے افسانہ نگار نہیں ہیں لیکن اگر حقیقی معنوں میں دیکھا جائے تو اردو میں باضابطہ افسانہ نگاری کی شروعات پریم چند

سے ہی ہوتی ہے۔ان کے افسانہ ''بڑے گھر کی بیٹی'' کو افسانہ نگاری کے فن کے لحاظ سے اردو افسانہ نگاری میں اولیت حاصل ہے۔ان کی افسانہ نگاری اردو کی افسانوی تاریخ میں روایت کا درجہ رکھتی ہے۔انھوں نے ہر طرح کے (سماجی، اصلاحی، سیاسی، نفسیاتی) افسانے لکھے۔حب الوطنی، انسان دوستی، اصلاح پسندی، آدرش واد اور حقیقت نگاری ان کی افسانہ نگاری میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔فنی لحاظ سے بھی پریم چند کے افسانوں کا ایک منفرد مقام ہے۔ پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، تکنیک اور زبان واسلوب میں بھی کوئی ان کا ثانی نظر نہیں آتا۔ان کی افسانہ نگاری کا سفر ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' سے شروع ہو کر ان کے آخری افسانوی مجموعہ ''واردات'' تک محیط ہے۔''کفن''، ''پوس کی رات''، ''حج اکبر''، ''سوا سیر گیہوں''، ''راہ نجات''، وغیرہ ان کے مقبول ومشہور افسانے ہیں۔''کفن'' ان کا ایسا افسانہ ہے جو فن اور موضوع کے اعتبار سے نہ صرف اردو افسانہ نگاری میں بلکہ دنیا کے کسی بھی ادب میں اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے۔

پریم چند کے علاوہ ان کے معاصرین کا بھی اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں بہت ہی اہم مقام ہے۔یہ وہ زمانہ ہے جب اردو میں افسانہ نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ پریم چند اور ان کے ہم عصر افسانہ نگاروں نے اردو افسانہ نگاری کے بال و پر سنوارنے اور اس کی پرورش و پرداخت میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔اس اکائی میں ہم ان کے ان معاصرین افسانہ نگار کا ذکر کریں گے جو 1900ء سے پہلے پیدا ہوئے اور جن کے افسانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔

27.3 پریم چند کے معاصرین

27.3.1 راشد الخیری

پریم چند کے معاصرین میں سب سے پہلا اور اہم نام راشد الخیری کا ہے۔راشد الخیری کی پیدائش 1868ء میں دلی کے ایک ادبی اور علمی گھرانے میں ہوئی۔آپ کے والد کا نام عبد الواحد تھا اور ڈپٹی نذیر احمد آپ کے پھوپھا تھے۔آپ بہت چھوٹے تھے کہ آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ آپ نے انگریزی اور حساب کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ 1891ء سے 1910ء تک سرکاری ملازم رہے۔1936ء میں 68 سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

اس سے قطع نظر کہ اردو کا پہلا افسانہ نگار کون ہے راشد الخیری بلا شبہ اردو کے اولین افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں۔ان کا پہلا افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' 1903ء میں رسالہ ''مخزن'' میں شائع ہوا۔''افراط وتفریط''، ''خدا فراموش''، ''مظلوم بیوی کا پاک جذبہ''، ''فسانۂ تنویر''، ''مچھیرن کا جھولا''، ''بھنور کی دلہن''، ''محرومِ وراثت'' وغیرہ ان کے اہم اور مشہور افسانے ہیں۔''قطراتِ اشک'' ان کا اولین افسانوی مجموعہ ہے۔اس کے علاوہ ''سوکن کا جلاپا'' اور ''گوہر مقصود'' ان کے دوسرے افسانوی مجموعے ہیں۔

راشد الخیری کی افسانہ نگاری سرسید کی اصلاحی تحریک کے تحت تعلیم نسواں اور حقوق نسواں کے اردگرد گھومتی نظر آتی ہے۔ وہ بطور مصلح سماج میں عورت کے کردار، ان کی ترقی اور ان کے اوپر ہونے والے مظالم پر کھل کر بات کرتے ہیں اور اپنی تحریروں میں ہر ممکن ان کی اصلاح کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کو مسلم عورتوں میں انقلابی اور اصلاحی لہر پیدا کرنے، ان کی تعلیم و تربیت اور ان کے حقوق کی لڑائی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ عورتیں سماج میں آزاد اور باوقار زندگی گزاریں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے بیش تر افسانوں میں لڑکیوں کی پیدائش، تعلیم و تربیت، شادی، طلاق، وراثت سے لے کر عورت پر مرد کی بالادستی اور ان کے استحصال تک کا ذکر کیا ہے۔ بقول مرزا حامد بیگ:

> ''راشد الخیری نے تو علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو افسانے میں معاشرتی اصلاح پسندی کی داغ بیل ڈالی تھی اور مسلم تعلیم یافتہ لڑکیوں کی اخلاقی زبوں حالی اور معاشرتی انحطاط کو اپنا موضوع بنایا تھا اور یوں راشد الخیری نے جو روش نصیر اور خدیجہ میں اختیار کی تھی اور موضوعات کا جو دھارا پکڑا تھا تادم آخر اسے نہیں چھوڑا۔ اس اعتبار سے ان کے بیش تر افسانوں میں یکسانیت کا احساس ہوتا ہے۔ بہر طور راشد الخیری کا نام اصلاح معاشرت اور حقوق نسواں کے لیے جد و جہد کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ راشد الخیری کے یہاں متوسط طبقے کی پیش کش میں عورت موضوع خاص ہے اور آزادی نسواں مقصد خاص جس کے حصول کے لیے عورت کی مظلومیت کو انتہا مندی کے ساتھ سامنے لائے۔''

(مرزا حامد بیگ، اردو افسانے کی روایت، ص 34)

راشد الخیری کی اصل پہچان بھلے ہی عورتوں کے حق میں آواز اٹھانے والے کے طور پر ہے لیکن انھوں نے انگریز دشمنی، حب الوطنی اور ہندو مسلم یکجہتی پر بھی قلم اٹھایا ہے اور غالبا اس معاملے میں بھی انھیں اولیت حاصل ہے۔ ''سیاہ داغ'' اور ''کلونتیاں'' اس سلسلے کے اہم افسانے ہیں۔

راشد الخیری کے سامنے افسانہ نگاری کا کوئی نمونہ نہیں تھا اس لیے فنی اعتبار سے ان کے افسانوں میں کئی نقص نکالے جا سکتے ہیں لیکن اگر تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو انھوں نے جس وقت افسانہ نگاری کی شروعات کی اور جس جذبے سے انھوں نے لکھا وہ قابلِ قدر ہے۔ جذبات نگاری میں انھیں ملکہ حاصل ہے اور اسی وجہ سے وہ ادبی اور فنی لطافتوں سے کام لینے کے بجائے اپنے مقصد کے حصول کے لیے جا بجا تقریر کرتے نظر آتے ہیں جس سے ان کے افسانے فنی اعتبار سے ضعف کے شکار ہو جاتے ہیں اور ان میں مرکزی تاثر برقرار نہیں رہ پاتا ہے۔ ان کے پلاٹ کافی ڈھیلے ڈھالے اور پھیلے ہوئے ہیں اور تکنیک کافی سادہ اور بیانیہ ہے۔ کردار عام طور پر زمینی اور حقیقی ہیں لیکن اکثر افسانوں میں ان کے انجام غیر فطری ہوتے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کے فن کے متعلق

انوار احمد کہتے ہیں:

''وہ اپنے کرداروں کو عموماً انجام سے پہلے پٹخنی دے دیتے ہیں۔ بصورت دیگر انجام پر وہ اتنے بہت سے واقعات چند جملوں میں اس طرح ٹھونستے ہیں کہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں ہر کہانی ناول کا قالب مانگتی ہے۔ چند افسانوں کے سوا ہر افسانے کا انجام اس اعتبار سے عبرت ناک اور دردناک ہوتا ہے کہ برابر کردار عذاب الٰہی کا شکار ہو جاتا ہے وگرنہ ایک دم سے نادم ہو کر ہمارے دلوں سے اتر جاتا ہے۔''

(اردو افسانہ: تحقیق و تنقید، ص 52)

27.3.2 سجاد حیدر یلدرم

سجاد حیدر یلدرم پریم چند کے معاصرین میں سب سے اہم نام ہے۔ ان کی پیدائش 1880ء میں کانڈیر، جھانسی میں ہوئی جب کہ آبائی وطن نہٹور، بجنور ہے۔ ابتدائی تعلیم بنارس میں حاصل کرنے کے بعد 1892 میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، علی گڑھ میں داخلہ لیا اور پھر یہیں سے انھوں نے 1901ء میں بی اے کی ڈگری بھی حاصل کی۔ 1904ء میں ایل۔ ایل۔ بی کی تعلیم کے دوران ہی ان کی نوکری برطانوی سفارت خانہ بغداد میں ہوگئی۔ وہاں سے لوٹنے کے بعد انھوں نے کئی جگہوں پر مختلف عہدے پر ملازمت کی۔ 1912ء میں ان کی شادی سید نذر الباقر کی لڑکی نذر زہرا بیگم سے ہوئی جو بعد میں اردو دنیا میں نذر سجاد حیدر کے نام سے مشہور ہوئیں۔ 1921ء کو وہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے جہاں انھوں نے آٹھ سال تک خدمت انجام دی۔ بالآخر 1943ء میں لکھنو میں ان کی وفات ہوگئی۔ اردو کی مشہور و معروف ناول نگار اور افسانہ نگار قرۃ العین حیدر آپ کی ہی بیٹی تھیں۔

سجاد حیدر یلدرم کو بعضوں کے نزدیک پہلا اردو افسانہ نگار کہا جاتا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کی شروعات مغربی اور ترکی افسانوں کے ترجمے سے ہوتی ہے۔ ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ'' (جس کو انھوں نے انگریزی سے ترجمہ کیا ہے) کو ان کا پہلا افسانہ کہا جاتا ہے لیکن یہ افسانہ کم اور انشائیہ زیادہ ہے۔ ان کا پہلا طبع زاد افسانہ ''احمد'' ہے جو 1906ء میں علی گڑھ سے شائع ہوا۔ ''خیالستان'' اور ''حکایات و احساسات'' ان کے افسانوں اور مضامین کے مجموعے ہیں جن میں ترکی افسانوں کے ترجمے اور طبع زاد افسانے شامل ہیں۔ ''خارستان و گلستان''، ''صحبتِ ناجنس''، ''ازدواج محبت''، ''قلوپطرہ''، ''ایک مغنیہ سے التجا''، ''حکایۂ لیلیٰ و مجنوں'' اور ''ویران صنم خانے'' ان کے اہم اور مقبول و مشہور افسانے ہیں۔

سجاد حیدر یلدرم کا شمار رومانوی تحریک کے علم برداروں میں ہوتا ہے۔ چوں کہ ان کی افسانوی زندگی کی شروعات ترکی افسانوں کے ترجمے سے ہوئی جہاں کے افسانوں میں رومانیت غالب تھی اس لیے سجاد حیدر یلدرم کے طبع زاد افسانوں پر بھی اس کا گہرا اثر پڑا اور اس طرح وہ رومانوی تحریک کے نمائندہ نثر نگار اور افسانہ نگار ثابت

ہوئے۔ عام رومانوی تحریروں کی طرح ان کی تحریریں بھی تخیل، جذبات، حسن، محبت اور عورت سے پر ہیں لیکن ان کی تخیل پسندی عام روش سے الگ ہے اور ان کی جذبات نگاری بھی محض جذبات نگاری نہیں بلکہ اس میں عقل کی مداخلت ہے۔ ان کا رومان باعثِ اضطراب و ہیجان کے بجائے وجہِ سکون واطمینان ہے۔ عورت اور محبت ان کے خاص موضوع رہے ہیں۔ ان کی نظر میں محبت ہی وہ چیز ہے جو ادب کے لیے موضوع بن سکتی ہے اور عورت اس محبت کی مرکز ومحور ہے۔ وہ عورت کو سماج کے ضروری اور زندہ ومتحرک رکن کے طور پر دکھاتے ہیں اور ان کی تعلیم وتربیت اور آزادی کو ان کا حق بتاتے ہیں۔ ''سودائے سنگین''، ''نکاح ثانی''، ''صحبت ناجنس'' وغیرہ ان کے ایسے افسانے ہیں جن میں عورت کے کردار کو انھوں نے بہت ہی پرکشش، فعال اور ترقی پسند دکھایا ہے۔ بقول قرالعین حیدر:

> ''انھوں نے عورت کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ اب وہ چلمن کے پیچھے سے جھانکنے والی سرشار کی سپہر آرا نہ تھی۔ یہ عورت کو اپنے ہم راہ اپنے برابر لانا چاہتے تھے جو ہندوستان میں ناممکن تھا۔ انھوں نے اپنے قصبوں کی لڑکیوں کو لکھنؤ اور دہلی کی حویلیوں کی چہار دیواریوں سے نکال کر بمبئی کی چوپاٹی پر کھلی ہوا میں سانس لینے و دیکھنے کی تمنا کی۔ اس لیے انھوں نے ہندوستان سے باہر ترکی کو اپنا آئیڈیل بنایا۔''

(پگڈنڈی (امرتسر)، سجاد حیدر یلدرم نمبر، جلد۔، ص132)

فنی اعتبار سے اگر سجاد حیدر یلدرم کی افسانہ نگاری کا مطالعہ کیا جائے تو اکثر افسانوں میں ان کے پلاٹ اور کردار کمزور نظر آتے ہیں، لیکن ان سب کے باوجود ان کے افسانوں میں وحدت تاثر قائم رہتا ہے۔ رنگین اسلوب بیان اور شاعرانہ نثر ہوتے ہوئے بھی ان کے افسانوں میں کہانی پن برقرار رہتا ہے۔ ان کے پرشکوہ طرز تحریر کی وجہ سے قاری کو ان کی فنی کوتاہیوں کا اندازہ تک نہیں ہو پاتا۔ یلدرم کے افسانے داستانوی اور افسانوی دونوں اسلوب میں مل جاتے ہیں۔ وقار عظیم اپنی کتاب ''ہمارے افسانہ نگار'' میں سجاد حیدر یلدرم کی افسانہ نگاری کے متعلق فرماتے ہیں:

> ''سجاد حیدر ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے، ایک رومان پرست شاعر کی حیثیت سے اور ان سب سے زیادہ ایک جذبات نگار مصور کی حیثیت سے اپنے افسانوں میں حسن اور دل کشی پیدا کرتے ہیں۔ ان کا طرز بیان انھیں اور ان کے ان بلند مقاصد میں کامیاب ہونے میں زیادہ سے زیادہ مدد دیتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں زبان میں ناہمواری پیدا ہوگئی ہے۔''

(ہمارے افسانہ نگار، ص135)

27.3.3 سلطان حیدر جوش

سلطان حیدر جوش پریم چند کے ہم عصر اور اردو افسانے کے بنیاد گزاروں میں سے ایک ہیں۔ ان کی پیدائش 9/

نومبر 1886ء کو دہلی میں ہوئی۔ ان کے والد رئیس نذیر الدین فریدی خانوادے سے تھے جب کہ ان کی والدہ دہلی کے ایک اعلی اور تعلیم یافتہ گھرانے سے تھیں۔ آبائی وطن بدایوں ہے لیکن ان کا بچپن دہلی (ننھیال) میں گذرا اور یہیں انھوں نے بنیادی تعلیم و تربیت بھی پائی۔ میٹرک کے بعد اعلی تعلیم حاصل کرنے کے لیے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا لیکن ۱۹۰۶ء میں محسن الملک کے خلاف احتجاج بلند کرنے کی وجہ سے ان کا داخلہ منسوخ ہو گیا جس کے بعد انھوں نے تعلیمی سلسلہ منقطع کر دیا۔ 1912ء میں چچا بہادر ممتاز الدین کی سفارش سے نائب تحصیل دار کی ملازمت ملنے کے بعد اسی پیشے سے منسلک رہے یہاں تک کہ ترقی کر کے تحصیل دار اور ڈپٹی کلکٹر بن گئے۔ 1946ء میں ریٹائر ہونے کے بعد علی گڑھ میں سکونت اختیار کی اور یہیں ۱۱ر مئی 1953ء کو کینسر کی وجہ سے ان کی وفات ہوگئی۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کے قبرستان میں مدفون ہیں۔

سلطان حیدر جوش کا پہلا مطبوعہ افسانہ نابینا بیوی بتایا جاتا ہے جو ''مخزن'' میں دسمبر 1907ء میں شائع ہوا لیکن اگر خود سلطان حیدر جوش کی بات مانیں تو اس سے پہلے 1905ء سے 1906ء کے درمیان ان کا کوئی افسانہ ''تمدن'' یا ''نقیب'' میں شائع ہو چکا تھا۔ ''طوق آدم''، ''ہاں نہیں''، ''خواب و خیال'' اور ''عالمِ ارواح'' وغیرہ ان کی افسانہ نگاری کے بہترین نمونے ہیں جب کہ ''انقلاب'' ان کا طویل ترین افسانہ ہے۔ ''فسانۂ جوش'' اور ''جوش فکر'' ان کے مجموعے ہیں جن میں افسانوں کے علاوہ ان کے مختلف مضامین بھی شامل ہیں۔

سماجی اصلاح کے مقصد سے وابستہ ہو کر افسانے لکھنے والوں میں سلطان حیدر جوش کا نام پریم چند کے ساتھ نہ سہی لیکن ان کے بعد ضرور آتا ہے۔ 1857ء کی ناکام جنگ آزادی اور بغاوت کے بعد ہندوستانی عوام اور بالخصوص مسلمانوں کی جو حالت ہوئی اس سے پوری قوم پریشان تھی۔ قوم کے علما، ادبا اور دانشوران یہ سوچنے میں لگے تھے کہ اس پریشانی کے حل کے لیے کیا اقدام اٹھائے جائیں جن سے قوم کی خیر و بھلائی ہو اور قوم اس ابھرتی ہوئی صنعتی اور مادی دنیا میں اپنی جگہ بنا پائے۔ اکثر لوگ مغرب کی مادیت سے مرعوب ہو کر اس کی اندھی تقلید میں لگ گئے جس کے اثرات تعلیم و تربیت سے لے کر معاشرتی اور سماجی سطح پر بھی مرتب ہونے لگے۔ ادب بھی اس سے نہیں بچ پایا اور شاعری سے لے کر نثر تک اس کی زد میں آ گئی۔ ہیئت و مواد میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ نثر و نظم میں کئی اصناف وجود میں آئیں، خود افسانہ اسی تحریک کی پیداوار ہے۔ سلطان حیدر جوش کو مغرب کی یہ اندھی تقلید نہ صرف یہ کہ پسند نہیں آئی بلکہ ہندوستانیوں کے حق میں بہت مہلک اور مضر لگی۔ مغربی تہذیب اور اس کی تقلید کی وجہ سے ہندوستانی تہذیب میں جو برائیاں جنم لے رہی تھیں انھوں نے اپنے افسانوں اور دیگر تحریروں میں ان کو خوب واضح کیا اور اپنا قلمی مشن اور مقصد اسی کے خلاف جہاد کرنا بنا لیا۔ فسانۂ جوش میں شامل تمام افسانے اس مقصد کے تحت لکھے گئے افسانوں میں بہت اہم ہیں۔

چوں کہ جوش کی اصل ترجیح مغرب سے مرعوب سماج کی اصلاح ہے اس لیے وہ فن پر توجہ دینے کے بجائے اپنے اصل مقصد پر زیادہ دھیان دیتے ہیں اور یہی مقصد ان کے اسلوب کو طنزیہ اور مزاحیہ بھی بنا دیتا ہے۔ اکثر جگہ ان کا اسلوب خطابیہ بھی ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کے افسانوں میں کہانی پن باقی نہیں رہ پاتا ہے لیکن ان کی زبان و بیان کی وجہ سے افسانے میں قاری کی دل چسپی بنی رہتی ہے۔ ان کے آخری دور کے افسانے پہلے کے مقابلے فن کے زیادہ قریب ہیں۔ وقار عظیم ان کی افسانہ نگاری کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

> ''طرز بیان کی دل کشی تو ان کے یہاں بہت ہے اور پڑھنے والا برابر اس کے مزے لیتا

ہوا چلتا ہے لیکن اصلاح کا خیال اس قدر نمایاں ہے کہ افسانوی دل کشی اور کیف قطعی باقی نہیں رہتا۔ افسانوں میں اصلاح کا جذبہ جب نمایاں ہو جاتا ہے تو نہ افسانہ کا لطف باقی رہتا ہے نہ اصلاحی مقصد کی تکمیل ہونی ممکن نظر آتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے افسانے دل چسپ اور شاعرانہ لکچر ہیں جن میں نہ لکچر کا لطف ہے نہ شاعری کا۔ نہ خشک فلسفہ کی گہرائیاں ہیں نہ شاعری کی لطیف نزاکتیں۔ اگر زبان میں اتنا لطف نہ ہوتا تو شاید افسانہ پڑھنے والا ان میں ذرا سی دیر کو بھی دل چسپی نہ لے سکتا۔''

(ہمارے افسانہ نگار، ص 146 تا 147)

27.3.4 نیاز فتح پوری

معروف رومانوی ادیب و افسانہ نگار نیاز فتح پوری بھی پریم چند کے اہم معاصرین میں سے ایک ہیں۔ ان کا آبائی وطن فتح پور ہے جب کہ ان کی پیدائش 1884ء میں بارہ بنکی کی تحصیل رام سنیسی گھاٹ میں ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر کے علاوہ فتح پور، ندوہ اور رام پور کے مدارس سے حاصل کی۔ میٹرک کرنے کے بعد پولس کی ملازمت کرنے لگے اور 1901ء میں سب انسپکٹر مقرر ہوئے لیکن اس کے ایک سال بعد ہی نوکری سے سبکدوش ہو گئے۔ اس کے بعد مختلف چھوٹی بڑی ریاستوں، اخباروں اور اداروں میں کام کیا۔ 1915ء میں بھوپال چلے گئے اور یہیں انھوں نے مشہور رسالہ ''نگار'' جاری کیا۔ 1927ء بھوپال چھوڑ کر لکھنو آ گئے۔ 1962ء میں حکومت ہند نے انھیں پدم بھوشن سے نوازا لیکن اسی سال وہ پاکستان ہجرت کر گئے۔ 24/اپریل 1966ء کو کراچی میں کینسر کے مرض سے ان کی وفات ہوگئی۔

نیاز فتح پوری اردو کے اولین افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کا آغاز ''ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر'' سے ہوتا ہے۔ ''ایک شاعر کا انجام'' اور ''شہاب کی سرگزشت'' ان کے طویل ترین افسانے ہیں جنھیں بعض لوگوں نے ناولٹ بھی کہا ہے۔ ''کیوپڈ اور سائکی''، ''چاند کا سفر''، ''زائر محبت''، ''عورت''، ''محبت کی دیوی'' وغیرہ ان کے اہم افسانے ہیں۔ ''نقاب اٹھنے کے بعد''، ''نگارستان'' اور ''جمالستان'' وغیرہ ان کے مشہور افسانوی و ادبی مجموعے ہیں۔ ان مجموعوں میں طبع زاد افسانوں کے علاوہ کئی دوسری زبانوں کے افسانوں کے ترجمے بھی موجود ہیں۔ ''تاریخ کے گمشدہ اوراق'' ان کے تاریخی افسانوں کا مجموعہ ہے۔

اردو افسانے میں جب بھی رومانوی افسانے کا ذکر ہوتا ہے تو سجاد حیدر یلدرم کے بعد اگر کسی کا نام آتا ہے تو وہ نیاز فتح پوری ہیں۔ وہ ادب لطیف کے سب سے بڑے اور اہم نام ہیں۔ ان کے یہاں رومانیت سجاد حیدر یلدرم کی تحریروں کے توسط سے ضرور آئی لیکن دونوں کے انداز اور اسلوب کافی مختلف ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم کے افسانے رومانوی ہوتے ہوئے بھی عقلیت اور مقصدیت سے خالی نہیں ہیں جب کہ نیاز فتح پوری کے افسانوں (چند کو چھوڑ کر) میں ان چیزوں کا کائی دخل نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک ادب محض مشغلۂ خلوت اور لطف اندوزی کا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں حقیقی دنیا اور اس کے مسائل سے دور ہو کر خیالی جہان آباد کیے ہیں۔ رومان، حسن، محبت اور عورت ان کے خاص موضوع رہے ہیں۔ عورت سے ان کو

ہمیشہ سے علاقہ رہا ہے اور اسی لیے انھوں نے اپنے بیش تر افسانوں میں عورت کی نفسیات کا بہترین تجزیہ پیش کیا ہے۔ یونانی اساطیر اور قدیم رومانی و دیومالائی کہانیوں کو بھی انھوں نے اپنے افسانوں میں اچھے اور بہتر انداز میں بیان کیا ہے۔

نیاز فتح پوری کی افسانہ نگاری پر گفتگو کرنے سے پہلے افسانہ نگاری پر خود ان کی رائے جاننا زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں:

> ''میں آپ کو بتاؤں کہ افسانے کی ضروری اجزا کیا ہیں۔ ایک کسی واقعہ میں بحیثیت واقعہ ہونے کے واقعیت کا پایا جانا۔ دوسری نفسیاتی طور سے کسی کردار و سیرت کو نمایاں کرنا۔ اس کو انگریزی میں Dramatic Touch کہتے ہیں۔ پلاٹ کو ایسے اجزا میں تقسیم کرنا کہ پڑھنے والے کو ایک سے زائد خلا خود اپنے ذہن سے پر کرنا پڑے۔ چوتھے ہلکا سا مزاح، خواہ وہ الفاظ سے پیدا کیا جائے یا مفہوم سے۔ اگر پلاٹ میں کوئی کیفیت رومان کی پیدا کر کے تھوڑا سا تمثیلی رنگ دے دیا گیا تو اور زیادہ دل چسپی پیدا ہو جائے گی۔''

(افسانہ پر نیاز کی رائے، نیاز فتح پوری، نگار نمبر، ص 282)

اگر ان کے افسانوں کو موجودہ تنقیدی معیار کے بجائے خود ان کے فنی اصولوں پر دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی افسانہ نگاری میں اپنے فن پر بہت زور دیا ہے۔ اپنے خاص اسلوب اور پلاٹ و کردار سے بھی انھوں نے اپنے افسانوں میں رومانی کیفیت پیدا کی ہے۔ ان کی افسانہ نگاری میں ان کی زبان اور اسلوب کا رول نمایاں ہے۔ یہ ان کے اسلوب کا ہی نتیجہ ہے کہ ان کے کردار خیالی اور غیر حقیقی ہونے کے باوجود کہانی کے تاثر میں کسی طرح کے ضعف اور کمزوری کی وجہ نہیں بنتے ہیں۔

27.3.5 سدرشن

پریم چند کے معاصر افسانہ نگاروں میں سے ایک نام سدرشن کا بھی ہے۔ ان کی پیدائش 1896ء میں سیالکوٹ، پنجاب کے ایک کشمیری برہمن خاندان میں ہوئی۔ بی اے تک کی تعلیم حاصل کی اور پھر روزگار کے سلسلے میں کانپور اور کلکتہ جیسے بڑے شہروں کے چکر لگانے کے بعد بالآخر ممبئی میں مقیم ہو گئے۔ وہاں انھوں نے فلمی دنیا میں کافی کامیابی حاصل کی اور 50 کے قریب فلموں میں گانے، کہانیاں اور مکالمے لکھے۔ 1967ء میں ہارٹ اٹیک سے ممبئی کے ایک ہسپتال میں ان کی وفات ہو گئی۔

سدرشن کا پہلا مطبوعہ افسانہ پھول ہے جو ''مخزن'' میں 1914ء میں شائع ہوا۔ انھوں نے قریب 150/ افسانے لکھے جن میں ''شاعر''، ''وزیر عدالت''، ''صدائے جگر خراش''، ''دو دوست'' اور ''فریب دولت'' وغیرہ ان کے کامیاب اور اہم افسانے ہیں۔ سدرشن کا پہلا افسانوی مجموعہ ''طائر خیال'' ہے۔ اس کے علاوہ ''چندن''، ''قوس

قزح''، ''بہارستان''، ''چشم و چراغ''، ''سولہ سنگھار''، ''صبح وطن'' اور ''پریم چالیسی'' وغیرہ ان کے دوسرے اہم افسانوی مجموعے ہیں۔

سدرشن صرف پریم چند کے ہم عصر ہی نہیں تھے بلکہ ان کے مقلد اور پیروکار بھی تھے۔ ان کی طرح یہ بھی گاندھیائی فکر اور آریہ سماج تحریک سے کافی متاثر تھے۔ ان کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ بھی اپنے پلاٹ اور کردار کا انتخاب اپنے اردگرد کے ماحول سے کرتے ہیں اور سماج (بالخصوص متوسط طبقہ کے ہندو سماج) میں پھیلی مختلف برائیوں کی اصلاح کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ بقول مرزا حامد بیگ:

> ''مہاشہ سدرشن کی نمایاں پہچان مہاتما گاندھی کے افکار کا پرچار اور تکنیکی سطح پر مخصوص نوع کی اصلاح پسندی ہے، جس کی مثال سدرشن سے پہلے محض چند برس پریم چند کے یہاں دکھائی دی تھی۔ شاید اسی لیے سدرشن کو پریم چند کا مقلد کہا جاتا ہے جب کہ ان دونوں کا فرق بہت ہے۔ سدرشن لہجہ کے اعتبار سے رومانی ہیں اور ان کا اظہار شاعرانہ۔ تشبیہات سے انسانی جذبات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ افسانوی تدبیر کاری کے اعتبار سے سدرشن نے اردو افسانے میں نفسیاتی تجزیہ کی بنیاد رکھی اور ڈھکی چھپی نفسیاتی الجھنوں پر سے پردے اٹھائے۔ یاں اہمیت کے قابل بات یہ ہے کہ سدرشن کے کردار طے شدہ نفسیات کے حامل نہیں ہیں اردگرد کا تبدیل ہوتا ہوا ماحول ان کی شخصیت سازی کرتا ہے۔''

(افسانے کی روایت، ص55-54)

سدرشن پریم چند کے مقلد ہونے کے باوجود ان سے الگ ہیں۔ دونوں کے اسلوب و بیان اور زبان میں کافی فرق ہے۔ پریم چند کے برعکس سدرشن کا خاص موضوع دیہات نہ ہو کر شہر کے سفید پوش ہندو ہیں۔ سدرشن کے افسانے میں قناعت پسندی اور دنیا سے بے رغبتی کا رجحان اس قدر غالب ہے کہ ان پر صوفی ہونے کا گمان ہوتا ہے۔

فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو افسانے کے فن پر سدرشن کی پکڑ اتنی مضبوط نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود ان کے بعض افسانے فنی اعتبار سے مکمل مانے جاسکتے ہیں۔ فطری اور حقیقی کردار، عام فہم زبان اور سادہ لیکن دل کش اسلوب ان کی افسانہ نگاری میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ سدرشن کی افسانہ نگاری کی ایک خاص خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے بیش تر افسانوں کا خاتمہ المیہ ہوتا ہے۔ بطور افسانہ نگار سدرشن کو اگر کوئی چیز ان کے تمام معاصرین سے ممتاز کرتی ہے تو وہ ان کی جذبات نگاری ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں اس قدر جذبات نگاری سے کام لیتے ہیں کہ وقار عظیم نے ان کو ''اردو کا سب سے بڑا جذبات نگار افسانہ نویس'' کہا ہے۔

27.3.6 علی عباس حسینی

علی عباس حسینی غازی پور کے موضع پارہ میں 3 فروری 1897ء کو ایک سادات گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی

تعلیم حاصل کرنے کے بعد مشن ہائی اسکول الہ آباد سے میٹرک اور انٹر کیا۔ کیننگ کالج لکھنو سے بی ایکر کے الہ آباد آ گئے اور پھر الہ آباد ٹیچر ٹریننگ کالج سے 1921ء میں ایل۔ ٹی کرنے کے بعد الہ آباد یونی ورسٹی سے 1924ء میں ایم۔اے (تاریخ) کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد پہلے اسکول ٹیچر ہوئے پھر گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنو میں درس وتدریس کا کام انجام دیا۔ 1954ء میں پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد لکھنو میں ہی سکونت اختیار کی اور یہیں 1969ء میں ان کی وفات ہوگئی۔

1917ء میں اپنے پہلے افسانے ''غنچۂ ناشگفتہ'' سے افسانہ نگاری کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد علی حسینی نے اردو دنیا کو ایک سے ایک بہترین افسانے دیے۔ ان کے افسانے ''آئی سی ایس''، ''رفیق تنہائی''، ''بوڑھا اور بالا''، ''سکھی'' وغیرہ بہت زیادہ مقبول ومشہور ہیں۔ ''باسی پھول''، ''آئی سی ایس''، ''رفیق تنہائی''، ''میلہ گھومنی''، ''ندیا کنارے''، ''یہ کچھ ہنسی نہیں ہے'' اور ''الجھے دھاگے'' وغیرہ ان کے اہم افسانوی مجموعے ہیں۔

علی عباس حسینی پریم چند کی طرح ہی دیہات سے اپنی کہانی کا پلاٹ اٹھاتے ہیں لیکن یہ سماجی مسائل کے پیچھے نہیں پڑتے اور نہ ان کے جسمانی اور مادی پریشانیوں کو بیان کرتے ہیں بلکہ ان کے اندرونی جذبات وخیالات کو بیان کر کے ان کے درد کا اظہار کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ لوگ بھی ان کے جذبات سے آشنا ہوں اور ان کے درد کو جانیں اور سمجھیں۔ بقول وقار عظیم:

> ''علی عباس حسینی کی افسانہ نگاری کا سب سے بڑا راز ان کا دردمند دل ہے۔ جیسا دل خود ان کے پہلو میں ہے ویسا ہی دوسروں کے پہلو میں بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ فطرت انسانی کی دکھتی ہوئی رگوں کو پکڑتے ہیں۔ سخت دلوں کو دردمند بنانا چاہتے ہیں۔ دردمند دلوں میں درد سے بڑھ کر تڑپ اور تڑپ سے زیادہ اضطراب و بے چینی کے جذبات کی جلوہ فرمائی دیکھنے کے شائق ہیں۔ فطرتِ انسانی کی کمزوریوں سے واقف ہیں۔ اس لیے انھیں آڑ بنا کر ایسی ایسی چٹکیاں لیتے ہیں کہ لوگ بے چین ہو جائیں۔ ان کے دلوں میں یہ بے چینی اس حد تک بڑھے کہ وہ دوسروں کے درد میں کسک اور ٹیس محسوس کرنے لگیں۔''

(ہمارے افسانہ نگار، ص 131)

انھوں نے سماج کے مفلسوں، فاقہ زدوں، جولاہوں، عورتوں وغیرہ کے دکھ کو چنا اور ان کی پریشانی اور تکلیف کو سماج کے سامنے لانے کی کوشش کی۔ انسانی نفسیات پر ان کی مضبوط پکڑ ہے جس سے وہ اپنے افسانے میں بھرپور کام لیتے ہیں۔ وہ گاندھی کے بہت بڑے مداح تھے۔ ان کے اصول وافکار سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ ان کی اہنسا، ستیہ گرہ اور دوسرے نظریات کی حمایت میں انھوں نے متعدد افسانے بھی لکھے۔ ان کی شہادت پر بھی انھوں نے ایک افسانہ ''شیر کا باغ'' لکھ کر ان کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ انگریزی ادب سے بھی ان کی بہت

زیادہ قربت تھی جس سے ان کی افسانہ نگاری بہت متاثر ہوئی، خود ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے افسانے کے متعلق جو کچھ سیکھا ہے وہ ''انگریزی ادب کا عطیہ'' ہے۔

علی عباس حسینی کے افسانے موضوع و مواد کے ساتھ ساتھ فنی نقطۂ نظر سے بھی کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے پلاٹ میں کہیں کسی طرح کا کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ کردار نگاری میں انھیں ملکہ حاصل ہے، وہ اپنے کرداروں کے جذبات و خیالات سے بہت فائدہ اٹھاتے ہیں، ان کے کردار اسی دنیا اور زمین کے ہوتے ہیں لیکن وہ ان کی ذہنی کشمکش اور نفسیاتی کیفیات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ لافانی کردار بن جاتے ہیں۔ جزئیات نگاری، ایجاز و اختصار، حسن بیان، جذبات نگاری اور رومانوی انداز و اسلوب وغیرہ ان کے افسانوں کو دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں۔

27.3.7 اعظم کریوی

اعظم کریوی پریم چند کے ہم عصر اور ان کے پیروکاروں میں سے ایک ہیں۔ ان کی پیدائش 22/جون 1898ء کو الہ آباد ضلع کے موضع کرئی، پرگنہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد میٹرک اور انٹر کیا۔ شروع میں شاعری وغیرہ کی پھر ادبی مجلّہ ''طوفان'' جاری کیا۔ ملٹری کوارٹر میرٹھ کے ویٹنری شعبہ میں ملازمت کی۔ 1947ء میں ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے اور وہاں ڈائریکٹوریٹ آف میموریل آرمڈ فورسز، کراچی میں ملازمت اختیار کی۔ 22/جون 1954ء کو نامعلوم افراد کے ہاتھوں قتل کر کے شہید کر دیے گئے۔

اعظم کریوی کا پہلا افسانہ پریم کی انگوٹھی ہے جو خود ان کے مجلّہ ''طوفان'' میں 1914ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے بہت سارے افسانے لکھے جو خواص و عوام میں یکساں مقبول و مشہور ہوئے۔ طبع زاد افسانوں کے علاوہ ان کے افسانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ایسی بھی ہے جن کا انھوں نے دیگر ہندوستانی زبانوں سے ترجمہ یا اخذ کیا ہے۔ انھوں نے 150 سے زیادہ طبع زاد و غیر طبع زاد افسانے لکھے لیکن ان کے افسانوی مجموعوں میں بس 90 کے قریب افسانے ہی جمع ہوئے ہیں۔ ''شیخ و برہمن''، ''پریم کی چوڑیاں''، ''دکھ سکھ''، ''انقلاب''، ''کنول''، ''روپ سنگھار'' اور ''دل کی باتیں'' ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ ان تمام مجموعوں کو اعظم کریوی کے صاحب زادے خالد اعظم صاحب نے نئے سرے سے سگما پریس، اسلام آباد سے 2009ء میں شائع کیا ہے۔ ''مہاجر کی عید'' ان کا آخری افسانہ ہے جو روزنامہ جنگ، کراچی میں ان کی وفات کے بعد 1955ء میں شائع ہوا۔

اعظم کریوی اردو کے اولین افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے جس دور میں افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا وہ دور پریم چند کی اصلاح پسندی اور حقیقت نگاری کا دور تھا، چناں چہ ان کے افسانوں میں بھی اصلاح پسندی اور حقیقت نگاری کا ہی رجحان عام ہے۔ بعض افسانے رومانوی طرز کے بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں ہمیشہ مغربی تہذیب کے خلاف لکھا اور ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و تمدن کو فروغ دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ سامنے کے واقعات سے افسانے کا پلاٹ اٹھا کر آفاقیت کے درجے تک پہنچانا

ان کا خاصہ تھا۔ ان کے افسانوں میں دیہات اور شہر، امیر اور غریب، عورت اور مرد غرض ہر طبقے کی نمائندگی ملتی ہے لیکن دیہات اور اس کے مختلف مسائل کو انھوں نے جس انداز و اسلوب سے بیان کیا ہے وہ ان کی پہچان بن گئی ہے۔ بقول ساغر نظامی:

> ''وہ راجہ، رانی، بادشاہوں اور شہزادوں کا ثنا خواں نہیں ہے۔ وہ ہندوستانی دیہات اور گاوں کی زندگی کا نمائندہ ہے، اس کی تصویریں ہندی اور ان تصویروں کا رنگ خالص آفاقی ہے۔ وہ ہندوستانی گاوں کی پاک اور بھینی زندگی اور غریبوں کے بے لوث معاشرت اور اس سادہ معاشرت میں جان ڈالنے والی سچی محبت کا مصور ہے۔''

(پیش لفظ ''شیخ و برہمن''، سگما پریس، اسلام آباد، پاکستان)

انھوں نے اپنے افسانوں میں دیہی زندگی اور اس کی معاشی کشمکش کو بخوبی بیان کیا ہے لیکن ان کے یہاں پریم چند کی طرح گہرائی اور گیرائی نہیں پائی جاتی۔ ان کے بعض افسانوں میں دیہاتی زندگی کے رومان کا ذکر بھی ملتا ہے لیکن ان کے افسانے نفسیاتی تجزیے اور ایمائیت سے خالی ہیں۔

سامنے کے پلاٹ اور حقیقی کردار کے انتخاب کی وجہ سے ان کے افسانوں میں حد درجہ ارضیت پائی جاتی ہے۔ مکالمہ نگاری میں انھوں نے اپنے ہنر کے جوہر دکھائے ہیں۔ دل کش اسلوب اور حقیقت و رومان کی آمیزش کی وجہ سے ان کے افسانوں میں قاری کی دل چسپی بنی رہتی ہے۔ زبان پر انھیں اس قدر عبور حاصل ہے کہ وقار عظیم نے ان کی زبان کو ان کے افسانوں کی جان کہا ہے۔ سادہ اور عام فہم ہونے کے علاوہ ان کی زبان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں اردو اور ہندی الفاظ اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ ان کے درمیان فرق کر پانا نہایت مشکل امر ہو جاتا ہے۔

27.4 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ

- پریم چند اور ان کے معاصرین سے متعارف ہوئے
- پریم چند کے معاصرین کی مختصر سوانح سے واقف ہوئے
- پریم چند کے معاصرین کی افسانہ نگاری اور ان کے فن سے متعارف ہوئے

27.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ اردو کے چار ابتدائی افسانہ نگار اور ان کے اہم افسانوی مجموعوں کے نام لکھیے۔

2۔ پریم چند کے پیروکار افسانہ نگاروں کے نام بتائیے۔

3۔ سلطان حیدر جوش کی افسانہ نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

4۔ نیاز فتح پوری کی رومانیت سجاد حیدر کی رومانیت سے کیوں کر الگ ہے؟ واضح کیجیے۔

27.6 سوالات کے جوابات

1۔ اردو کے چار ابتدائی افسانہ نگار اور ان کے نمائندہ افسانوی مجموعے کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

پریم چند	کفن
راشد الخیری	قطراتِ اشک
سجاد حیدر یلدرم	خیالستان
سلطان حیدر جوش	فسانۂ جوش

2۔ پریم چند کے مقلد اور پیروکار افسانہ نگاروں میں مہاشہ سدرشن، علی عباس حسینی اور اعظم کریوی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

3۔ سلطان حیدر جوش کی افسانہ نگاری مشرق و مغرب کی تہذیب کے درمیان صریح خط کھینچتی ہے۔ انھوں نے مغرب کی تہذیب و تمدن کو ہندوستانیوں کے لیے مہلک و مضر جانا اور ہمیشہ اپنے افسانوں میں اسی کے خلاف لکھا۔

ان کے اکثر افسانے فنی اعتبار سے نامکمل ہیں۔ پلاٹ کافی کمزور اور کردار غیر جان دار ہوتے ہیں۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے جا بجا تقریر کرتے رہتے ہیں جس سے افسانوی دلچسپی جاتی رہتی ہے اور کہانی پن برقرار نہیں رہ پاتا ہے البتہ ان کے طنزیہ و مزاحیہ اسلوب اور ان کی دل کش اور پر لطف زبان ان کے افسانوں کو دل کش بنا دیتے ہیں۔

4۔ سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری دونوں رومانوی تحریک کے علم برداروں میں سے ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم جہاں رومانیت کے امام ہیں تو وہیں نیاز فتح پوری اس رجحان کے سب سے بڑے افسانہ نگار اور مصنف مانے جاتے ہیں۔ رومانوی تحریک سے وابستہ ہونے کے باوجود دونوں کی ترجیحات الگ الگ ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم جہاں رومانیت کے ساتھ ساتھ عقل اور مقصد کا ساتھ نہیں چھوڑتے وہیں نیاز فتح پوری اپنے افسانوں کو محض مشغلہ خلوت اور لطف اندوزی کا ذریعہ بتاتے ہیں۔ دونوں کے یہاں عورت کا کردار بہت اہم ہے اور مرکز و محور کی حیثیت سے ہے لیکن ایک جگہ عورت سماج کی ایک اہم ہستی اور اس کی ترقی کے لیے نہایت ضروری رکن ہے تو دوسری جگہ عورت محض محبت اور حسن کی پیکر ہے۔

27.7 فرہنگ

لفظ	معنی
استحصال	ناجائز فائدہ اٹھانا، ہتھیانا
آفاقیت	عالم گیریت
بنیادگزار	بنیاد رکھنے والا
پیکر	سراپا، جسم، مجسم
خلوت	تنہائی
روش	طریقہ، چال
سبکدوش	لاتعلق
طبع زاد	ایجاد کردہ، اپنا لکھا ہوا
فعال	کام انجام دینے والا، کرگزرنے والا
قالب	سانچہ، ڈھانچہ
لطیف	باریک، نازک
معاصر	ہم عصر، ایک ہی زمانے کا
مقلد	تقلید کرنے والا، پیروی کرنے والا، پیروکار
ممتاز	نمایاں، فرق، واضح
محور	دھرا، قطب، مدار
مضر	نقصان دہ
نمایاں	واضح

27.8 کتب برائے مطالعہ

1 ہمارے افسانہ نگار	وقار عظیم	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ	1979ء
2 داستان سے افسانے تک	وقار عظیم	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ	2003ء
3 اردو افسانے کی روایت	مرزا حامد بیگ	عالمی میڈیا پرائیوٹ لمٹیڈ	2014ء
4 اردو کے نمائندہ افسانہ نگار	فرزانہ شاہین	ڈائمنڈ آرٹ پریس	2009ء
5 اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل	صغیر افراہیم	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ	2009ء